فعولن

پروفیسر غضنفر

''بشریٰ''حمزہ کالونی، نیوسرسید نگر ایکسٹینشن، علی گڑھ (یوپی)، موبائل:9990237388

رشید کا پورا نام رشید قریشی تھا۔ بہار کے کسی دیہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ آ کر رشید سے فعولن ہو گئے۔ فعولن ان کا نام اس لیے پڑ گیا کہ جب بھی استادِ محترم کوکب قدر صاحب عروض پڑھاتے وقت کسی سے شعر کی تقطیع کرنے کے لیے کہتے تو جواب دینے کی خواہ کسی کی بھی باری ہو، رشید صاحب فوراً بول پڑتے: ''فعولن فعولن فعولن'' اور فعولن کا یہ وزن بحرِ متدارک والے شعروں میں بھی دہرا دیتے۔ شعروں کی گردان میں پہل، بحرِ رمل کو بحرِ رجز میں ڈالنے اور فعولن کے ساتھ بدفعلا نہ عملِ مسلسل اور اپنے اس عمل پر احساسِ ندامت کے بجائے بے حسی و بے عملی کا ڈھٹائی سے مظاہرہ رشید قریشی کا ایسا رویہ تھا کہ اس پر تو کوئی نہ کوئی نام انھیں ملنا ہی تھا ایسی حرکتوں کے لیے علی گڑھ پروفیسروں تک کو نہیں بخشتا تھا اور ان کی حرکتوں کی بنیاد پر کسی کو انڈا، کسی کو گھوڑا، کسی کو بکرا، کسی کو بردلا اور کسی کو بھنڈی بنا دیتا تھا۔ ایک تو بات بات میں فعولن اوپر سے رشید صاحب کا آوازوں کو دور اور دیر تک کھینچنے والا خالص بہاری لب ولہجہ سنجیدہ شعروں میں بھی مزاحیہ آہنگ گھول دیتا تھا۔ سفید شیروانی، سنہری عینک اور سیاہ صورت والی منہنی شخصیت جب فعولن فعولن کرتی ہوئی کھڑی ہوتی تو کلاس کسی مزاحیہ ڈرامے کا اسٹیج بن جاتا اور ایسا لگتا جیسے بن خاں: اپنے زمانے کا مشہور مزاحیہ کردار نے آرٹس فیکلٹی میں انٹری لے لی ہو۔ پتلی دبلی گردن سے نکلنے والی اس عروضی گردان کا اثر یہ ہوتا کہ طلبہ وطالبات کے گلے سے ہنسی کا فوّارہ پھوٹ پڑتا۔ بحرِ متقارب کا رکنِ فعولن ان کی شخصیت کے ساتھ ایسا چپکا کہ یہ ان کے وجود کا مترادف بن گیا۔ خدا نے فعولن کو فرصت میں جو بنایا تھا سو تو بنایا ہی تھا خود فعولن نے اپنے لباس، گفتار اور ہاؤ بھاؤ سے اپنے سراپے کو ایسا بنا لیا تھا کہ ان کو دیکھتے ہی آنکھیں شرارت پر اتر آتی تھیں اور ہونٹ گستاخ ہو جاتے تھے۔ اوپر سے مزاج میں رنگینی ایسی کہ ایک عشق کی ناکامی کی گرمی ابھی سرد ہوئی نہیں کہ دوسرا عشق سرگرمِ عمل ہو گیا۔

وہ معاشقے، جو خاموشی سے شروع ہوئے اور چپ چاپ ختم ہو گئے ان کا تو مجھے علم نہیں، مگر جو عشق دھوم دھڑاکے کے ساتھ شروع ہوا اور آہ وزاری پر ختم ہوا وہ ہے جو سلمیٰ سے ہوا۔ فعولن میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ محبوب کے انتخاب میں خود کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ اس انتخاب میں بھی اس بات کا پورا پورا خیال رکھا کہ معشوق سولہ آنے نہیں تو چودہ پندرہ آنا ضرور ان سے میل کھائے یا وہ اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نظر آئیں۔ اس کے پیچھے شاید یہ نفسیات کام کرتی تھی کہ اُدھر سے انکار کی گنجائش نہ بچے۔ اس کے باوجود اکثر انھیں انکار کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ سلمیٰ کے سلسلے میں انھوں نے بڑی کوشش کی کہ اقرار کی صورت نکل آئے اور کم سے کم اس بار تو انکار کی ضرب نہ سہنا پڑے۔ اس کے لیے میری منّت سماجت کر کے مجھ سے ایک نظم بھی لکھوائی اور مجھ سے یہ قسم لے لی کہ میں کسی سے نہ کہوں کہ یہ نظم میں نے لکھی ہے۔ میں نے بڑی محنت سے نظم تیار کی اور اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ نظم میں کسی آئیڈیل محبوب کے حسن کی پیکر تراشی ابھر آئے اور فعولن کے دل کی لگی اور ان کی حالتِ آشفتہ سری کی تصویر بھی کھنچ جائے۔ کئی دنوں کی محنت ومشقت کے بعد نظم مکمل ہوئی۔ نظم کا عنوان بھی ''سلمیٰ'' رکھا گیا۔ کوشش تو یہ بھی کی گئی کہ نظم میں فعولن کا وزن بھی آ جائے، مگر نہ جانے کیسے فعولن فاعلاتن میں تبدیل ہو گیا اور وزن تھوڑا بڑھ گیا۔ نظم کا بول تھا:

اے مری جانِ تمنّا مری پیاری سلمیٰ
زندگی سے بھی مری بڑھ کے دلاری سلمیٰ

نظم میں نے فعولن کے حوالے کی اور انھوں نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں ایک چکنے کاغذ پر نقل کر کے اسے سلمیٰ کی خدمت میں پیش کر دی۔ لفافہ ہاتھ میں آتے ہی سانولی سلونی سلمیٰ کے چہرے کا رنگ اور بھی (سیاہ) ہو گیا جیسے لفافے میں کوئی سانپ رکھ کر اسے پکڑا دیا گیا ہو۔ سلمیٰ کی کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ ایک بار لفافہ کھول کر دیکھو تو سہی۔ چنانچہ سہیلی کے اصرار پر سلمیٰ نے لفافہ کھول کر نظم نکال لی۔ سلمیٰ کے ساتھ ساتھ اس کی سہیلی نے بھی نظم پڑھ ڈالی۔ پوری نظم تو یاد نہیں ہاں، یہ ایک بند میرے حافظے میں ضرور رہ گیا ہے:

صرف اک بار مگر پیار سے دیکھو تو سہی
جذبۂ عشق کو میرے کبھی پرکھو تو سہی

اس خزاں خوردہ چمن پر کبھی برسو تو سہی
اے میری جانِ تمنّا مری پیاری سلمٰی

زندگی سے بھی مری بڑھ کے دلاری سلمٰی

نظم پڑھ کر سلمٰی کے غصّے کا پارہ اور بڑھ گیا تو سہیلی دھیرے سے بولی:

''یار! نظم تو اچھی ہے اور تمھاری کتنی تعریف کی گئی ہے۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ کوئی تمھیں اس نظر سے دیکھتا ہے، مگر تم تو ایسی لال پیلی ہو رہی ہو جیسے سیاہ تحریر نے کسی بچھو کی طرح تمھیں ڈنک ماردی ہو۔

''ڈنک ہی سمجھو''، سلمٰی نے کُڑھ کر جواب دیا۔

''کیوں؟''

اس کیوں پر پہلی بار سلمٰی سہیلی کی طرف نظر اٹھا کر بولی:

''نظم تو ٹھیک ہے، مگر دیکھتی نہیں ہو کہ نظم کس کلموہے کی طرف سے آئی ہے؟'' سلمٰی کے اس جواب پر اس کی سہیلی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

سلمٰی کو جب پتہ چلا کہ نظم میں نے لکھی ہے تو ایک دن میرے پاس آئی اور بناوٹی غصّہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ''غضنفر! تم نے اچھا نہیں کیا جو اس طرح مجھے سرِ عام رسوا کیا۔

نظم لکھی تھی تو خود دے دیتے اس کے لیے ایسے بھونڈے اور رقیبِ روسیاہ نامہ بر کا انتخاب کیوں کیا؟ ڈائریکٹ دے دیتے تو میرے آنسو ضائع تو نہیں ہوتے۔''

میں نے بہت صفائی پیش کی کہ میں نے نظم اپنے لیے نہیں لکھی، مگر سلمٰی یہ بات ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہیں، یہ تو بھلا ہو میری کلاس کی دوسری لڑکیوں کا کہ وہ بیچ میں کود کر بیچ بچاؤ کرنے اور مجھے اس بلائے ناگہانی سے نجات دلانے میں کامیاب ہو سکیں۔

فعولن کا دوسرا زور دار عشق رضیہ سلطانہ سے ہوا۔ اس عشق کا شانِ نزول واقعی عجیب و غریب ہے۔ گرمی کی طویل چھٹیوں میں ضرورت مند طلبا رجسٹرار آفس کے ایڈمیشن سیل میں عارضی طور سے کام پر لگا لیے جاتے تھے۔ ایک بار رشید صاحب بھی کام پر لگ گئے۔ فارموں کی جانچ پرکھ کے دوران انھیں ایک ایسا فارم بھی ملا جسے پہلے تو انھوں نے رجیکشن کی ٹوکری میں ڈالا پھر اسے باہر نکال لیا۔ فارم سے چپکا ہوا کاغذ کا کوئی انوکھا پرزہ انھیں نظر آ گیا تھا۔ غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی لڑکی کا فارم تھا اور وہ لڑکی کافی ستم رسیدہ تھی۔ لڑکی کی بے چارگی پر ان کا دل پسیج گیا۔ کچھ دفتری تگڑم کر کے انھوں نے اس فارم کو اس قابل بنا دیا کہ وہ انتخاب والی ٹوکری میں پہنچ گیا اور فارم کے پتے پر ایک عدد پوسٹ کارڈ بھی تحریر کر دیا کہ اس فارم پر انھوں نے خصوصی نگاہِ التفات فرما دی ہے۔

پوسٹ کارڈ کے جواب میں لڑکی کی طرف سے دینی بھائی کے تخاطب کے ساتھ شکریے کے ڈھیر سارے لفظوں کے ہمراہ جوابی لفافہ بھی موصول ہو گیا۔ اِدھر سے جلد ہی مینشن نوٹ والا خط گیا تو اُدھر سے دعاؤں سے بھرا اور طلبِ عنایات کی تمنّاؤں سے پُر ایک اور تفصیلی جواب آ گیا۔ پھر کیا تھا، خط و کتابت کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ القاب و آداب کے پرانے الفاظ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑتے گئے اور ان کی جگہ نئے لفظوں کے برگ و بار لگتے گئے۔ بھائی کب کہاں چلا گیا اور بہن کب کہاں کھو گئی پتہ ہی نہ چلا۔ داخلے کے لیے یونی ورسٹی سے جب سرکاری لیٹر پہنچا تو لڑکی کی والدہ کی جانب سے فعولن کی خدمت میں ایک التجا نامہ روانہ کیا گیا کہ رضیہ کا سر سے باپ کا سایہ تو کب کا اٹھ چکا، کوئی بھائی وائی بھی نہیں جو اسے یہاں سے لے جائے۔ اگر آپ تشریف لائیں تو ہم آپ کے بے حد مشکور ہوں گے۔ فعولن اس نیک کام کے لیے بنا کسی ہچکچاہٹ کے تیار ہو گئے۔ چونکہ فارموں پر ان دنوں فوٹو چپکانا ضروری قرار نہیں دیا گیا تھا اس لیے بنارس جاتے وقت دورانِ سفر اپنے تصور میں رضیہ کی کوئی ٹھوس شبیہ بنانے میں کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ جاتے وقت آنے والے کی صورت دیکھنے کی بیتابی بڑھتی جا رہی تھی اور یہ بے تابی اور بڑھ گئی جب آنے والے کو سیاہ برقع میں نہایت احتیاط کے ساتھ ان کے ہمراہ لگا دیا گیا۔ فعولن نے مجھے خود بتایا کہ میں دیکھنے کے لیے بے چین تھا، مگر علی گڑھ سے پہلے میں رضیہ کا چہرہ نہ دیکھ سکا اور جب علی گڑھ اسٹیشن پر رضیہ نے اپنے رخ سے نقاب اُٹھایا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے عرش پر لے جا کر فرش پر پھینک دیا ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے فعولن کو مخاطب کیا، ''رشید صاحب! رضیہ نے جب پہلی بار آپ کو دیکھا ہوگا تو اسے بھی تو شاید ایسا ہی کچھ محسوس ہوا ہوگا۔'' فعولن میری بات کا مطلب سمجھ تو گئے تھے، مگر میری دوستی کی خاطر صرف مسکرا کر رہ گئے۔

حضرتِ فعولن جب پوری طرح اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہو گئے تو اس سے ملانے کے لیے مجھے ایک دن عبداللہ کالج لے گئے۔ اطلاع بھیج کر ہم رضیہ کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد نیلی پجمیا اور لال کرتی میں ایک سیاہ رنگت والی پستہ قد کی لڑکی کسی کٹھ پتلی کی طرح ٹھمکتی ہوئی گیٹ سے باہر

نکلی۔فعولن مجھے چھوڑ کر اسے لینے کے لیے لپکے اور واپس آ کر ہم دونوں کا تعارف کرانے لگے۔اسے دیکھ کر مجھے ویسا تو نہیں لگا جیسا کہ فعولن کو علی گڑھ اسٹیشن پر لگا تھا، مگر ایسا کچھ ضرور محسوس ہوا کہ میں ان کے ساتھ آئس کریم کھائے بغیر ہی ان سے رخصت لے کر واپس آ گیا۔

ایڈجسٹ مینٹ کے باوجود یہ عشق بھی کچھ دنوں بعد فعولن ہاتھ سے نکل گیا۔ یقیناً ان کی بھٹکی ہوئی نگاہ کسی اور چہرے پر جا ٹکی ہوگی، مگر اس کا علم مجھے نہ ہو سکا۔نظر کا یہ بھٹکاؤ وحید اختر کے اس شعر والا نہ تھا:

ٹھہری ہے تو اک چہرے پر ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

بلکہ یہ بھٹکاؤ تو کوئی کنارہ پانے کی سعی میں سرگرداں رہنے والا بھٹکاؤ تھا جو نہ جانے کب تک فعولن کے ساتھ بھٹکتا رہا۔خدا کرے ان کا یہ بھٹکاؤ کوئی ٹھہراؤ پا گیا ہو!

علی گڑھ سے جانے کے برسوں بعد ایک دن میرے امیر نشاں والے مکان پر دستک ہوئی۔ بڑھ کر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک لاغر سا آدمی چشمے میں کھڑا ہے۔

''پہچانا! میں رشید۔'' پہچاننے کی کوشش میں کر رہا تھا کہ وہ پھر بول پڑے۔''فعولن'' فعولن کا لفظ ان کے منہ سے نکلتے ہی میں ان سے لپٹ گیا۔محسوس ہوا اس عرصے میں فعولن کا اندر سے کوئی حرف گر چکا ہے، ہلکے پھلکے تو پہلے بھی تھے، مگر ان سے بغل گیر ہوتے ہوئے اتنا ہلکا پن کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔غور سے دیکھا تو چشمے کی گولائیوں کے پیچھے دو ہالے بھی نظر آئے جن کی سیاہیوں کو دیکھ کر میری پتلیاں لرز اٹھیں۔

''کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟'' میرے پوچھنے پر بولے۔

''پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں وہاں نہیں ہوں، جہاں مجھے ہونا چاہیے اور دوسرے سوال کے جواب میں بس یہ کہوں گا کہ اردو کی شیرینی تو کام نہیں آئی اس لیے شہد کا کاروبار کر لیا ہے۔مکھیاں پالتا ہوں اور چھتّوں سے شہد نکالتا ہوں۔

''مذاق چھوڑیے، سچ بتائیے کیا کر رہے ہیں؟''

''یہ مذاق نہیں ہے غضنفر! سچ یہی ہے۔تمھیں یقین اس لیے نہیں آ رہا ہے کہ تم اپنے جیسے کسی کام کی توقع کر رہے ہوگے، مگر میں اسے ہی غنیمت سمجھتا ہوں کہ مکھیوں کے کاٹنے کے باوجود مٹھاس ملتا رہتا ہے۔ ورنہ تو ہمارے اردگرد بہت سارے ایسے بھی لوگ ہیں جن کے اندر کڑواہٹ ہی کڑواہٹ ہے۔ایک اور سوال کرنے کو بھی جی چاہا، مگر ہمت نہ ہو سکی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی مٹھاس میں بھی کڑواہٹ گھل جائے۔

○○

آثارالصنادید

اردو اکادمی، دہلی نے سرسید احمد خاں کی لافانی تصنیف ''آثارالصنادید'' کا اصل متن نامور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کی لافانی تصنیف ''آثارالصنادید'' تاریخ سے سرسید کے علمی، تحقیقی و ثقافتی دلچسپی کا نقشِ آغاز ہے۔اس میں انھوں نے دلّی کے آثارِ قدیمہ اور تاریخی عمارات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمہ میں سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان عوامل کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے سرسیّد کو یہ کتاب تیار کرنے پر آمادہ کیا نیز فنِ تعمیر پر بھی تحقیقی انداز میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔

دہلی کے آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں نیز تاریخ و تحقیق کے طالب علموں کے لیے اردو اکادمی، دہلی کا ایک نایاب تحفہ۔

صفحات: ۷۲۸، (دوسرا ایڈیشن) قیمت: ۲۴۰/روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی